SEMESTER 3 MA.URDU

CC-11 Unit 4 TARAQQI PASAND TAHREEK ME ADAB

Presented by. Dr.Shahab Zafar Azmi,Associate Professor

Department of Urdu Patna University.Patna

Mob;8863968168 Email;drshahabzafar.azmi@gmail.com

سبق کے خدوخال

0 مقصد

1 تعارف

2 ترقی پسندافسانہ

3 ترقی پسندشاعری

4 ترقی پسندتنقید

5 خلاصہ

6 مشق کے لئے سوالات

7 مزید مطالعہ کے لئے کتابیں

0 مقصد :

اردو کی ادبی تحریکوں میں ترقی پسند تحریک سب سے اقت ور، منظم اور دیر پا اثرات کی حامل تحریک تھی۔ اس نے جہاں سیاست، سماج اور تحریک آزادی پر اپنے اثرات قائم کئے وہیں اُردو زبان وادب پر بھی اس کے اثرات بڑے پیمانے پر مرتب ہوئے۔ چونکہ اِس تحریک سے اُردو کے ادیب، شاعر اور قلم کار حجرات بڑی تعداد میں وابستہ تھے اس لئے اس نے اُردو کی کئی اصناف مثلاً افسانہ، ناول، شاعری، تنقید وغیرہ میں لسانی اور فکری دونوں سطحوں پر تبدیلیاں پیدا کیں اور ادب کے دھارے کو ایک واضح سمت عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ترقی پسند تحریک کے ادبی پہلو اور ادبی خدمات سے روشناس کرانا ہے۔

1 تعاوف :

ترقی پسند تحریک کا سیاسی پہلو زیادہ فعّال تھا اور اس تحریک کا بیشتر ہنگامہ اس کی سیاست پسندی کا ہی زائیدہ ہے۔ تاہم اس حقیقت

ک اعتراف ضروری ہے کہ ترقّی پسند تحریک بیسویں صدی کی ایک منظّم فعّال اور موثّر تحریک تھی اور اس کے سیلاب میں اچھے اچھے لوگ تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''یہ تحریک سرسیّد کے بعد اردو ادکا سب سے پُرجوش اور پرزور تخلیقی مظاہرہ تھا۔ اردو ادب کی تین اصناف یعنی افسان، شاری اور تنقید کو نہ صرف اس تحریک، نے متاثر کیا بلکہ ادب کی ہیئت اجتماعیہ کو انسانی شعور سے رہنمائی حاصل کرنے، سائنسی انداز میں تجزیہ کرنے اور ان دونوں کے امتزاج سے زندگی کی بصیرتوں کو نئے مفاہیم نکھارنے کی قوّت عطا کی۔ اس تحریک نے منطقی ستدلال اور حقیقت پسندانہ تجزیے کو فروغ دیا۔ اور معشی حقائق کو تسلیم کر کے ستھصالی قوّتوں کی نشان دہی کی۔ اس تحریک کے مقاصد میں عوام کی بہبودی اور ایک کوشحال معاشرے کی تعمیر کو فوقیت حاصل تھی۔ چنانچہ بلند انسانیت میں اعتقاد اور کچلے ہوئے عوام کو ایک باعظمت مقام دلانے کی خواہش نے بہت سے نئے ادبا کو اس تحریک کی طرف متوجّہ کیا۔ نتیجتہً ترقی پسند روایت کے ساتھ وابستگی ہی ادب میں ترقّی کا وسیلہ شمار ہونے لگی۔ اردو ادب کی سابقہ تھریکیں لالۂ خودرو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی ابتدا اور فروغ بیشتر اتفاقات اور معدودے چند افراد کا مرہونِ منّت ہے۔ ترقّی پسند تحریک ایک ہمہ جہت اور جامع تحریک تھی۔ اس کے پسِ پشت ایک واضح نصب العین اور منصوبہ بندی موجود تھی۔ چنانچہ اس نے نہ صرف ادب کے مباحث پیدا کئے بلکہ زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کی۔ اس کا استخراج بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک ترقّی پسند تحریک بکھری ہوئی حالت میں نظر آتی ہے۔ انگارے کی اشاعت نے عوام کو جدیدیت کی ایک نئی کرو سے متعارف کرایا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک اس تحریک نے اپنے نظریات کا بیج بکھیرا اور رفیقوں اور ہمنواؤں کی خاصی بڑی جماعت کو دارۂ اثر میں لے لیا۔ اس عرصے میں تحریک کے وہ معاونین جو اس کے مقاصد کے ساتھ زیادہ دور تک نہ چل سکے تحریک سے الگ ہو گئے اور تحریک کی قیادت انقلابی نوجوانوں نے سنبھال لی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا دور تحریک کا عروجی دَور ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف تحریک کا حلقۂ اثر وسیع ہوا بلکہ اس نے فتوحات بھی حاصل کیں اور تحریک کے نصب العین کو روایت کا درجہ دے کر بہت سے ادبا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس دور میں انتہا پسندی کے رجحانات کو بھی تحریک میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ تطہیر، احتساب اور سزا کی روش پیدا ہوئی۔ آادی کے بعد س تحریک نے عسکری حیثیت اختیار کر لی اور فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے لئے ایک بری قوّت سے تصادم کا حوصلہ بھی پیدا کیا۔

ترقّی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو ادب تخلیق ہوا اس پر ترقّی پسند نظریّے کی چھاپ گہری لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس ادب میں پراپگینڈا تشہیہ اور تبلیغ کا عنصر وافر مقدار میں موجود ہے۔ تحریک کا مقصد بے حد نمایاں نظر آتا ہے۔ تاہم جب زندگی کا مشاھدہ ادیب کے تجربے کا جزو بن جاتا ہے تو ایسے ادب پارے بھی تخلیق ہوتے ہیں جن میں جمالیاتی شان موجود ہوتی ے اور جنہیں تنقید کے سخت پیمانوں پر پرکھنے کے باوجود جاوداں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے بعض ادبا نے جو ادب پیش کیا، اس میں زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کی رواں تنقید بھی موجود ہے اور اس نے مستقبل کو متاثر بھی کیا ہے۔

2 ترقی پسند افسانہ :

ترقّی پسند افسانے کی روایت کا رشتہ براہِ راست پریم چند کی حقیقت نگاری سے وابستہ ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو داستانی

ماحول سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی کے ساتھ قائم کر دیا تھا۔ چنانچہ پریم چند کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے اور انہوں نے انسانی عظمت اور محنت کو بلند مقام عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ تاہم پریم چند کے ہاں کسی خاص نظریّے کی بازگشت نظر نہیں آتی اور مقصد زیرِ سطح رہتا ہے۔ ان کا افسانہ ''کفن'' اس کی نمائندہ مثال ہے چنانچہ معنوی طور پر پریم چند کو اوّلین ترقی پسند افسانہ نگار تسلیم کرنا درست ہے۔

کرشن چند طبعاً رومانی فنکار تھا اور بقول انتظار حسین بیشتر مقامات پر وہ زندگی سے گریزاں بھی نظر آتا ہے۔ تاہم اس کی معروجیت گہرے سماجی شعور کی آئینہ دار ہے اور اس کا فن عمرانی حقیقت کا عکّاس ہے۔ انسانی زنگی کے بنیادی سوال کرشن چندر کے افسانوں کی بنت میں شامل ہیں اور وہ اپنے عہد کی نمائندہ حقیقت کو اسلوب کی فطری رعنائی میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ اکالو بھنگی۔ ان داتا۔ گرجن کی ایک شام۔ بالکونی۔ برہم پترا اور پیاسا وغیرہ چند ایسے افسانے ہیں جن میں انسان کی ازلی اور ابدی مھرومیوں کے گرد حقیقی واقعات کا تانا بانا مرتّب کیا گیا ہے اور سانس لیتی ہوئی زندگی کو ارتقا کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کرشن چندر چونکہ ترقّی پسند تحریک کا فنکار تھا اس لئے اکثر اوقات س کے فن پر نظریہ غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ ''تین غنڈے''۔ پشاور ایکسپریس۔ امن کی پانچ انگلیاں اور ''چیری کے پھول'' وغیرہ افسانوں میں وہ ایک جانبدار ادیب کے روپ میں ابھرا اور وہ صداقت کو منوانے کے بجائے ترقی پسند نظریے کا جواز تلاش کرنے میں سرگردان نظر آتا ہے۔ اس قسم کے افسانون میں جذبے کی گرفت کمزور ہے اور وہ کرشن چندر جو بقول احتشام حسین جذباتی وفور کا افسانہ نگار ہے کہیں نظر نہیں آتا۔

احمد علی کو اوّلین شہرت ''انگارے'' نے عطا ی اور ابھی ''انگارے'' کی آگ سرد نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے افسانون کا ایک نیا مجموعہ ''شعلے'' پیش کر دیا۔ احمد علی نے ان افسانوں میں مٹتی ہوئی تہزیب پر جرآت و بے باکی سے طنز کیا اور اس قلعے کو پاش پاش کرنے کی کوشش ی۔ انگارے نے ڈاکٹر رشید جہاں کو بھ بطور افسانہ نگار متعارف کرایا۔ تاہم افسانہ ان کی زندگی کا مقصد نظر نہیں آتا بلکہ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''ان کی ہر بات صنفِ لطیف کا مرثیہ معلوم ہوتی ہے۔''

کرشن چندر کے افسانوں میں جذبہ مائل بہ افق نظر آتا ہے۔ س کے برعکس راجندر سنگھ بیدی جذبے کی پرواز کو نمایاں نہیں ہونے دیتا اور وہ زمین کے ساتھ لپٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیدی نے انسانی دکھوں، پریشانیوں اور محرورمیوں کو ہی موضوع بنایا ہے۔ لیکن یہ سب افسانے میں مستقیم انداز میں وارد ہونے کے بجائے اس کی روح میں مسائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ گرم کوٹ۔ گرہن، دوسرا کنارہ لاجونتی ببّل اور متھن میں واضح مقصدیت موجود ہے اور بیدی نے بنیادی اہمیت اپنے تجربے کو دی ہے اور اس کی گہرائی سے صاقت اور معنویت خود بخو دافسانے کا حصّہ بن گئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بیدی کے افسانے ک جڑیں ہندوستان کی اساطیری روایت میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ اور وہ اپنے داخل کی پُراسرار آواز پر یوں کان دھرتا ہے کہ اس ماضی فن پارے کی روح میں شامل ہو جاتا ہے۔ یوں بیدی کا افسانہ انسانیت کے تقاضوں کو تو پورا کرتا ہے۔ لیکن ترقّی پسندی کے واضح مقاصد کی تبلیغ نہیں کرتا۔

خواجہ احمد عبّاس ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو زندگی کی تعبیر صرف ترقّی پسند نظریات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس کے افسانون میں

سماجی مسائل اور سیسی الجھنوں کو اہمیّت حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ہر تازہ واقعے پر افسانہ لکھنے کی اہلیّت رکھتا ہے اور اس کے مشاہدے اور تخلیق میں ذرا سا وقفہ بھی نظر نہیں آتا۔ خواجہ احمد عبّاس ترقّی پسند تحریک کا ایسا رپورٹر ہے جس پر افسانہ نگار کا گمان کیا جاتا ہے۔ اس کے کردار حقیقی ہونے کے باوجود غیر فطری نظر آتے ہیں۔ اور اکثر اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عبّاس افسانے کے واقعات کو بھی نظریاتی فوقیّت ثابت کرنے کے لئے ہی استعمال کر رہا ہے۔ ایک لڑکی۔ سردار جی۔ انتقام۔ شکر اللہ کا چڑھاؤ اتار وغیرہ افسانے تیزی سے معیّنہ سمت کی طرف بڑھتے ہیں اور ردِّ عمل پیدا کئے بغیر ایک مخصوص منزلِ مراد پر ختم ہو جاتے ہیں۔

عصمت چغتائی کی شہرت میں عظمت کم اور حیرت زیادہ تھی۔ جنس نگاری کی آڑ میں انہوں نے معاشرتی اقدار کو توڑنے کی کوشش کی اور ترقّی پسند تحریک کی نامور افسانہ نگار شمار ہوئیں۔ عصمت بنیادی طور رحقیقت نگار ہیں لیکن ان کے ہاں ٹھہراؤ اور توان کی کمی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے انہیں جنسِ لطیف کی جذباتی کیفیت بیان کرنے، نسبتاً گرم جملے لکھنے اور مرد کے جنسی میلانات کو متحرّک کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اور اسی عادت نے ان کے ہاں فحش لذّتیت پیدا کی ہے۔ ان کے ہاں قدرون کو توڑنے کا رجحان تو موجود ہے لیکن انقلاب کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ چنانچہ عملی زندگی میں وہ کسی نئے نظام کی تخلیق میں شامل نہیں ہوتیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے افسانوں میں زندگی کا ارضی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے نچلے متوسط طبقے کی معاشی، سماجی اور جنسی محرومیوں کی سچّی کہانیاں لکھی ہیں۔ اور خارجی تشنگی کو داخلی حقیقت سے سیراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشکؔ کے س قسم کے افسانوں میں نسور، ابال، کونپل اور چٹان کو اہمّت حاصل ہے۔ اشک کی ترقّی پسندی روایتی نہیں چنانچہ انہوں نے قدروں کو توڑنے کے بجائے ان کی صحت مند تبدیلی کی طرف متوجّہ کیا ہے۔ اشکؔ کے افسانے قفس، ڈاچی اور چیتن کی ماں اس قسم کے رجھانات کی عمدہ مثالیں ہیں۔ حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا اساسی موضوع ہندوستان کی سماجی پستی اور معاشی بحالی ہے۔ ان کے واقعات حقیقی اور کردار فطری نظر آتے ہیں اور ان دونون کا امتزاج زندگی کو واقفیت کا رنگ دے دیتا ہے۔ آخری کوشش اور شکر گزار آنکھیں وغیرہ افسانے انسانی دکھون اور پریشانیوں کی عکّاسی حقیقت نگاری سے کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کا ہموار بیانیہ انسانی بصیرت کو اجالنے کی سعی کوتا ہے اور جذبات کو مشتعل کرنے کے بجائے توازن اور اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی پر سماجی حقیقت نگاری کا اثر کم اور رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔ ان کے ابتدائی افسانے بیکار نوجوانوں کے رومانی خوابوں کے عکّاس ہیں۔ ندیمؔ کے افسانوں کا دوسرا دور اس جدّ وجہد کو پیش کرتا ہے جب اس بیکر نوجوان کو ملازمت تو میسّر آجاتی ہے لیکن زندگی کے خواب ادھورے رہتے ہیں۔ امیر اور غریب کی آویزش کو اُبھارنے کے لئے ندیمؔ نے دیہات کو پسِ منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تاہم دیہات شہر کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے اور مایوسی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ندیمؔ کے افسانوں میں مقاومت کمترین کا جذبہ اور نامساعد حالات میں سمجھوتہ کر لینے کا انداز نمایاں ہے۔ اسی قسم کے افسانوں میں طلوع وغروب۔ الحمد اللہ مولوی ابُل۔ کنجری اور رئیس خانہ وغیرہ کو اہمیّت حاصل ہے۔ اس رجحان نے ان کے ہاں وہ کشمکش پیدا نہیں ہونے دی جو حقیقی زندگی کا خاصہ ہے۔ یہ نکت اس حقیقت سے بھی وضح ہے کہ ترقی پسند تھریک کا انقلابی منشور ان کی معتمدی کے زمانے میں منظور ہوا لیکن جب ترقّی پسدن تحریک احتساب کی زد میں آگئی تو اس منور کی تنسیخ کا اعلان بھی انہوں نے ہی کیا۔

اس لحاظ سے ندیمؔ کا اپنا کردار اکے افسانون میں بھی پوری طرح منعکس ہے اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

آزادی کے بعد جن افسانہ نگارون کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ان میں شوکت صدّیقی کو اہمیت حاصل ہے۔شوکت صدّیقی نے بالعموم ایسے کردار پیش کئے ہیں جن کی زندگی میں خیر کا تصوّر تو موجود ہے لیکن یہ جرم اور گناہ کے سائے میں پروان چڑھتا ہے۔خلیفہ جی، وانچو اور نیل کنٹھ مہاراج کا شمار ایسے ہی کرداروں میں کیا جاسکتا ہے۔شوکت صدّیقی کا افسانہ بظاہر حقیقت کا بے رنگ بیانیہ ہے، لیکن اس میں تاثّر کی گہرائی یقینا موجود ہے اور وہ طبقاتی نفرت کو اُبھار کر نچلے طبقے کو بیدار ہونے اور بالائی طبقے کو تہہِ تیغ کر ڈالنے کی کھلی آزادی دیتا ہے۔

ترقّی پسند تحریک نے اردو افسانے کو نہ صرف سماجی حقیقت پسندی کی طرف کیا بلکہ بڑی چابکدستی سے اس صنفِ اظہار کو مقصدیّت کا آلۂ کار بنانے کی سعی بھی کی۔ چنانچہ نئے افسانہ نگارون نے اپنے عہد کے دکھ۔ پریشانیاں، نارسائیاں۔طقاتی تضاد، جہالت اور توہّم پرستی وغیرہ کو براہِ راست اردو افسانے کا موجوع بنایا۔ان افسانوں میں انسانی فطرت کا مطالعہ زندگی کا مشاہدہ اور ان پر مستقیم انداز میں رائے دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ترقّی پسند تحریک سے افسانہ نگارون کی جو نئی نسل معروف ہوئی ان میں ابراہیم جلیس، مہندر ناتھ، پرکاش پنڈت، پریم ناتھ پردیسی، ہنسراج رہبرؔ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجّاد ظہیر، عابد سہیل، اے حمید اور آغا سہیل وغیرہ کو اہمیّت حاصل ہے۔ان افسانہ نگاون نے سماجی ناہمواریوں اور معاشرتی کروٹوں کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ چناچہ زندگی کے گھناؤنے پہلو تو نمایاں ہوگئے لیکن افسانہ نگار کا اپنے لاشعور سے رشتہ کمزور پڑ گیا اور وہ موجود زندگی کا نوحہ خوان بن کر رہ گیا۔حقیقت سپاٹ اور بے رنگ ہوگئی اور افسانہ اپنی فطری لطافت سے محروم ہوکر ایک ایسی شعوری کاوش نظر آنے لگا جس کے اجزا تو میکانکی انداز میں جڑے ہوئے تھے لیکن جس میں داخلی روح ناپید اتھی۔

ترقّی پسند افسانہ معنوی طور پر پریم چند کی حقیقت نگاری کی توسیع تھا۔بقول عزیز احمد ''اگر پریم چند کا افسانہ مشعلِ راہ نہ ہوتا تو بہت سے نوجوان جو آج کامیاب اور مہشور ہیں، اندھیروں میں بھٹکتے پھرتے ہوتے اور تقلیدی اسالیب کی مقبولیت اور بھی بڑھ گئی ہوتی۔'' اہم بات یہ ہے کہ جن افسانہ نگارون نے زندگی کو غیر جانبداری سے دیکھا اور نظریّاتی انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر اسے تخلیقی رعنائی سے موضوع بنایا، ان کے افسانوں میں حقیقت اور تخیّل کا امتزاج عمل میں آیا اور انہون نے زندہ رہنے والے افسانے لکھے۔ترقّی پسند افسانے کا دورِ عروج انیں افسانہ گناروں سے عبارت ہے اور ان کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔

3 ترقّی پسند شاعری :

معنوی اعتبار سے اردو میں ترقّی پسند شاعری کی اوّلین روایت کو علی گڑھ اور انجمن پنجاب کی تحریکوں نے فروغ دیا تھا۔محمد حسین آزاد نے اسے انکشاف، فطرت کے لئے اور حالیؔ نے مقاسد، ملّی کے حصول کے لئے استعمال کیا۔شبلی نعمانی، چکبست، اکبرالہٰ آبادی اور ظفری علی خاں کی شاعری میں مقصدیّت کی ایک مخصوص لہر بالائی سطح پر دوڑتی نظر آتی ہے۔اقبالؔ نے اخلاقی اور تہذیبی نام کو شکستہ کئے بغیر شاعری کا رُک مسائلِ حیات کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ اقبال کی ترقّی پسندی تخریب کے بجائے تعمیری مقاصد پر مبنی ہے اور یہ اپنی قوّت

مسلمانوں کے روشن ماضی سے حاصل کرتی ہے۔

جوش ملیح آبادی کی ترقّی پسندی ان کے لااُبالی ماج کا حصّہ ہے۔حیدرآباد کی ملازمت سے برطرفی کے بعدان کے ہاں احتجاج کا زاویہ اوررِدِّعمل کی قوّت پیدا ہوئی اوران کا روئے سخن انگیرزی حکومت کی طرف ہوگیا۔جوش کی چند مشہور نظمیں ''غلاموں کی بغاوت''۔ ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام''،''نظامِ نو''اور''انسانیت کا کورس''وغیرہ ہیں۔ان نظموں میں رجز کا انداز اور خطابت کا لہجہ نمایاں ہے۔بلاشبہ جوش کا تصوّرِ انقلاب ہندوستان کی غلامی کے رِدِّعمل میں پروان چڑھا تھا تاہم ان کے ہاں انقلاب کا واضح تصوّر موجود نہیں۔وہ فرد کو موجودہ نظام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ تو دیتے ہیں لیکن اس بغاوت کی جہت متعیّن نہیں کرتے۔چنانچہ قاری ان کے سیلِ رجز میں شامل ہونے کو ہی قومی کدمت تصوّر کرنے لگتا ہے۔

فیض احمد فیض ترقّی پسدن تحریک کے دوسرے اہم شاعر ہیں اوران کے ہاں ترقّی پسند نریے کا اوراک واضح انداز میں موجود ہے۔انہوں نے عشق سے انقلاب کی طرف قدم بڑھایا اورخوبانِ جمال سے علیٰحدگی اکتیا کر کے کشمکشِ اضطراب میں مبتلا ہوئے چنانچہ فیض کے بارے میں دوقسم کی اارا کا اظہار برملا ہوا۔اوّلاً یہ کہ ''فیض کسی نظریّے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے۔''ثانیاً''فیض کا ہر شعران بلندیوں کو چھورہا ہے جس کی ااج ترقّی پسدن ادب کو ضرورت ہے۔''حقیقت یہ ہے ک فیض کی شاعری میں جزبہ ورنظریّہ دونوں موجود ہیں۔عاشقی فیض کی عبادت ہے اور ترقّی پسندی فیض کا ریضہ۔جب فرض غالب آجاتا ہے تو ان دونوں میں حد، فاصل قائم ہوجاتی ہے لیکن جب وہ عشق کی عبادت کی طرف راغب ہوتے ہیں تو یہ حدِ فاصل مٹ جاتی ہے فیض کی شاعری میں عبادت کے ان احساسات کا ورود مختلف ادوار میں متعدد مرتبہ ہوا ہے۔

ترقّی پسند شاعری میں فیض کی عطایہ ہے کہ انہون نے نظریّے کی ترسیل کو مستقیم اورغیر مستقیم انداز میں پیش کرنے کے تجربے کئے۔ چنانچہ ان کی بیشتر نظموں میں حقیقت نگاری علامتی روپ میں ڈھل گئی ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری کے گرد ایک دائرۂ نور گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔فیض نے بہت سے ہنگامی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں اور جب موضوع ان کے داکل سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے تو کائنات کا غم ایک مثبت کردار کی طرح پوری نظم میں مرکزی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور قاری اس ہنگامے کی معنویّت سے گہرا تاثّر قبول کرتا ہے۔

اوراب رات کے سنگین وسیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نگہہ جاتی ہے
جابجا درد نے اک جال سا بن رکھا ہے

فیض کی منفرد عطایہ ہے کہ انہون نے لفظ کے گرد نیا احساسی دائرہ مرتّب کیا اوراسے سیاست آشنا بنادیا۔ترقّی پسند شعرا کے ہاں سرخ سویرا، حریری پرچم کاغذی ملبوس اور گلنار ہاتھ وغیرہ اس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی شعریّت ہی زائل ہوگئی ہے۔فیض نے نہ صرف نئے استعارے تخلیق کئے بلکہ قدیم شعرا کے مستعمل الفاظ کو بھی نئی تابندگی عطا کی اورایسی تراکیب وضع کیں جن پر ساختۂ فیض

کی مہر ثبت ہے حقیقت یہ ہے کہ جوشؔ نے ترقّی پسند شاعی میں انقلاب کی جو صدا لگائی تھی اس کی جہت فیضؔ نے متعیّن کی اور ترقّی پسند شاعری پر اتنے اثرات مرتّب کئے کہ بالآخر وہی ''گلشن کی طرزِ فغاں'' بن گئی اور اب یہ کہنا درست ہے کہ ترقّی پسند تحریک کی نظریاتی شاعری میں اگر کسی ایک شاعر میں زندہ رہنے کی قوّت موجود ہے تو وہ فیض احمد فیض اور فیض کی ان نظموں کو دوام ابد حاصل ہوگا جن میں فن اور نظریّے کا کیمیائی امتزاج عمل میں آیا ہے۔

علی سردار جعفری نے ترقّی پسند تھریک کا پیغام طالب علمی کے زمانے میں سنا اور پھر اس کی شعوری سطح پر یون قبول کیا کہ علی سردار جعفری کی پہچان ترقّی پسند تحریک کے وسیلے سے ہی ہوتی ہے۔ سردار جعفری کو مارکسی فلسفے نے نیا شعور عطا کیا تھا اور انہوں نے اپنے شعری عمل کو بالعموم اشتراکیت کے مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنایا جنانچہ ان کی شاعری اس مخصوص ڈاگر پر چلنے لگی جسے جوش نے لفظوں کی خشت بندی سے آراستہ کیا تھا۔ فرق یہ کہ جوشؔ کے ہاں نظریّاتی فکر کچھ زیادہ روشن نہیں لیکن سردار جعفری کسی تذبذب کا شکار ہوئے بغیر نظریّے کو بالراست استعمال کرتے ہیں۔ تلنگانہ، جشنِ بغاوت، سامراجی لڑائی، انقلابِ روس، سیلابِ حسین اور ملّاحوں کی بغاوت جیسے موضوعات پر انہوں نے طغیانِ خیال کو پورے ولولے سے شاعری میں ڈھالا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کوئی اب اڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں　　کوئی بادل سرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں

جاگ اُٹھے کوہ و صحرا، ناچ اُٹھے آبشار　　ہو گئے بیدار شام و نجد و ایران و تتار

ایک ہی ہلکے سے جھٹکے سے کلائی موڑ دے　　اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

علی سردار جعفری کی اس قسم کی نظموں میں لفظ اکہری صورت میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے بیانیہ انداز سے جذباتی لطافت زائل ہوجاتی ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ سردار جعفری کی شاعری اشتراکیت کا کھلا پروپگیندا ہے اور ان مصروعوں کا سپاٹ پن اور نثری انداز کھٹکتا ہے۔

مخدوم محی الدین کی شاعری میں رومان اور انقلاب کی اواز بیک وقت سنائی دیتی ہے ان کے ناقدین نے ان کی شاعری کو خلوص کی پیداوار قرار دیا ہے اور مخدوم نے اس خلوص کو اپنی محبوبہ اور نظریّے کے لئے یکساں طور پر برتا ہے۔ مخدوم کے عشق میں دفور اور وارفتگی ہے۔ اور عشق سے انقلاب کی طرف پیش قدمی میں بھی مخدوم کا والہانہ پن قائم رہتا ہے۔ چنانچہ مخدوم نے اقلاب کی آواز کو اپنی روح کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور کبھی کبھی زیر لبی کی لطیف کیفیت بھی پیدا کی۔

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ سریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ چمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن

مخدومؔ نے ترقّی پسند تحریک کی سیاسی جہت کو بھی اہمیّت دی اور بہت جلد ان کی شاعری پر بغاوت کا عنصر غالب آ گیا۔ چنانچہ مخدوم کا لہجہ جارحانہ اور آواز باغیانہ ہوگئی۔

پھونک دو قصر کو گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

ترقّی پسند شاعری میں مخدوم عرفانِ انقلاب کا زاعیہ ہے اور اس نے ایسی شاعری پیدا کی جس میں نعرے کی گونج اور محبوب کے قدموں کی چاپ دونوں شامل تھیں۔ اس ضمن میں مخدوم فیض کی شاعری سے متاثّر نظر آتا ہے۔

اسرار الحق مجازؔ کی شاعری میں تین اہم مقام آئے ہیں۔ وہ اوّلاً محبوبۂ دلنواز کے حسنِ فسوں گر کی مدح وتوصیف کرتا ہے۔ ثانیاً خالم سماج اپنے نوکیلے کانٹوں سے مجاز کو نہ صرف کچھ کے لگاتا ہے بلکہ یہ محبوبہ اور شاعر کے درمیان دیوار بھی بن جاتا ہے اور اس مقام پر مجازؔ وحشتِ دل کا شکار ہوجاتا ہے۔ آخری مقام وہ ہے جب مجازؔ انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے اور اپنے ساتھ عوام کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ :

گرادے قصرِ تمدّن کا، اک فریب ہے یہ　　اٹھا دے رسمِ محبّت، عذاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر　　جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجاز کی شاعری نے یہ تینوں مراحل نجیہ وخوبی طے کئے ہیں اور مخدوم محی الدّین کی طرح وہ اس چوتھے مقام سے بی گزرا ہے جہاں اس کی آواز میں عوامی لہجہ ابھرا ہے اور وہ البوہ کے ساتھ مل کر گاتا ہے۔

بول اری او دھرتی بول　　راج سنگھاسن ڈانواں ڈول

مجازؔ بنیادی طور پر رومانی شاعر ہے۔ تاہم ''رات اور ریل''۔ ''انقلاب'' اور ''شوقِ گریزاں'' وغیرہ میں اس نے واضح طور پر خارج کی طرف جست بھری ہے اور وہ ترقّی پسند تحریک کے اہم شعرا میں شمار کیا گیا ہے۔

کیفی اعظمی، جان نثار اختر اور ساحر لدھیانوی کا شمار ایسے ترقّی پسند شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نقطۂ نظر کی فوقیت کو تسلیم کیا اور شاعری کو مستقیم انداز میں نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنیا۔ ان کی شاعری میں محبت کا عمودی زاویہ بہت جلد حقیقت کے ارضی زاویے کے ساتھ منطبق ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ مزدور کا اور دہر کا غم بتدریج ابھرتا چلا جاتا ہے۔ ان میں سے کیفی اعظمی کے لہجے میں جلالی گھن گرج زیادہ ہے۔

جان نثار اختر نے غربت اور امارت کے تضاد کو خوبی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس سار حرلدھیانوی کے لہجے میں طنز کی زہرناکی زیادہ ہے۔

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم　　اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک　　ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

(ساحر)

ترقّی پسند شاعری میں زندگی کے خارج کو موضوع بنانے اور قاری کو براہِ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس تحریک

نے زندگی کی جبریّت کو براہِ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔اس تحریک نے زندگی کی جبرّ یت کو طنز کا نشانہ بنایا اور شاعر کو اس کے خلاف اونچی آواز میں احتجاج کرنے کی دعوت دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی اقدار کے خلاف ردِّعمل ک جذبہ پیدا ہوا اور معنوی طور پر اشترا کی حقیقت نگاری کو ادب کی اصلی نہج قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ترقی پسدن شاعری نے جذباتی اظہار کے لئے جو تین ذرائع استعمال کئے ان کی تفسیل حسب ذیل ہے :

اوّل۔ طبقاتی کشمکش کو متحرّک کرنے کے لے مزدور اور محنت کش کو موضوع بنایا گیا۔

دوم۔ نظامِ کہنہ کی شکست وریخت کے لئے انقلاب کو وسیلہ اور نئی سحر کو نشانِ منزل قرار دیا گیا۔

سوم۔ اوّلاً شاعر کا مرکزِ توجّہ گوشت پوست کی عورت بنی لیکن انقلاب کے دور،عروج میں اس عورت کی جگہ عروسِ وطن نے لے لی۔

ترقّی پسند نظریّے کے مطابق ادب اور سماج کا ہیرو ایک ہی ہے۔ چنانچہ ترقّی پسند تحریک نے مزدور کو سماج کا ہیرو بنا کر پیش کیا اور اس کی عظمت اور انسانیت کے گیت والہانہ انداز میں گائے۔ترقّی پسند شعرا نے اپنی پہچان کے لئے اپنے آپ کو بلاواسطہ طور پر مزدور طبقے کے ساتھ ہی منسلک کیا۔ چنانچہ جب ترقّی پسند شعرا ہیرو کی عظمت کے ترانے لکھنے لگے تو اس میں انہیں اپنی ذات کا عکس بھی نظر آنے لگا اور ترقّی پسند شاعری نہ صرف ہیرو پرستی کا شکار ہو گئی بلکہ اس میں کو دستاء کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔

میں ہوں خوشبوئے چمن،پیغمبرِ فصلِ بہار　　　لے کے آیا ہوں زمانے کیلیئے پیغامِ گل

ترقّی پسند شاعری کا ایک بنیادی مقصد چونکہ نظریے کی ترسیل ہے اس لئے شاعری میں بیانیہ اسلوب اور منطقی انداز فروغ پانے لگا۔ وہ کام جو نثر آسانی سے سرانجام دے سکتی تھی۔ جب نظم کو تفویض کیا گیا تو اس کی داخلی آنچ سرد پڑ گئی اور شاعری نثر کے قریب آ گئی۔ دوسری طرف پابند نظم کی اصناف میں سے مسدّس، مخمّس، اور مربّع کی ہیئت کو زیادہ استعمال کیا گیا اور خیال کو ذہن نشین کرانے کے لئے مترادفات کے ذریعے تکرار پیدا کی گئی۔ چنانچہ اس قسم کی نظموں میں بے جا طوالت پیدا ہوئی اور الفاظ شاعری کے موضوع پر حاوی ہو گئے۔ بلاشبہ ترقّی پسند شاعری نے ہیجان پیدا کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔اس دور میں ایسی شاعری بہت کم تخلیق ہوئی جو واقعاتی تناظر اور ردِّعمل سے آزاد ہو۔آج صرف ان شعرا کی نظمیں ہی زندہ ہیں جنہوں نے اپنی ذات سے رابطہ قائم کیا اور نامعلوم کے گہرے سمندر سے فن کے آبدار موتی حاصل کرنے کی سعی کی۔

4　ترقی پسند تنقید :

ترقّی پسند تنقید نے اپنے سانچے مارکس،لینن، اینگلز اور گورکی کے نظریّات سے اخذ کئے اور ادب کو معاشرے کی جدّوجہد میں ایک کارآمد حربے کے طور را ستعمال کرنے کی طرح ڈالی۔ترقّی پسند تحریک نے نہ صرف مصنّفین کا ایک سریع الارحلقہ قائم کیا بلکہ مسنّفین کی تخلیقات کو جدلیاتی فلسفے پر پرکھنے کے لئے ناقدین کی ایک فعّال جماعت بھی پیدا کی ترقّی پسند ناقدین نے ادب کا تجزیہ سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں افادی حیثیت کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے کیا اور اس مقصد کے لئے تنقید کا مارکسی پیمانہ اور سائنسی انداز استعمال کیا۔ترقّی پسند

ناقدین نے مارکسی فلسفے کی ان جزئیات کو واضح کرنے کی کوشش کی جن کے بارے میں ہندوستانی مصنّفین کا ذہن صاف نہین تھا اور جن کی عدم تفہیم کی بنیا پر ترقّی پسند تحریک کو قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس نئے اندازِ تنقید نے اُردو ادب کو فائدہ پہنچایا اور ادبا نے نہ صرف نئے مباحث پیدا کئے بلکہ فلسفہ، تاریخ اور نفسیات وغیرہ علوم کو بھی تنقید میں آزمانے کی سعی کی۔

ترقّی پسند تنقید میں اوّلین اہم نام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ ان کا مقالہ ''ادب اور زندگی'' ترقّی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز تصوّر کیا جاتا ہے۔ اختر رائے پوری کا نظریّہ ہے کہ ''آرٹ کا مقصد تلاشِ حسن نہیں بلکہ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور انسانیت اس سے اثر انداز ہوتی ہے۔ انہوں نے تقاجا کیا کہ ''ادب ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقّی کی راہ دکھائیں'' اکتر رائے پوری کے یہ نظریات زیادہ تر اشتراکی فلسۂ ادب سے ماخوذ ہین اور ان میں گورکی اور طالسطائی کی بازگشت موجود ہے ڈاکٹر اختر رائے پوری نے ادب کا مقصد تو متعیّن کیا ہے لیکن ادب کی تخلیق کے پیچیدہ عمل پر روشنی نہیں ڈالی۔ اس لئے ان سے سو فیصد اتفاق ممکن نہیں۔ اختر رائے پوری نے قدیم اور جدید ادب کا تجزیہ افادی نقطۂ نظر سے کیا تو وہ انتہا پسندی اور شدّت کا شکار بھی ہوئے۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اختر رائے پوری نے اردو تنقید کو پہلی مرتبہ مارکسی نظریّات سے آگاہ کیا اور تنقید کو ایک نئی جہت سے آشنا کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ وہ مارکسی تنقید کے اوّلین اہم نقّاد ہیں اور بہت کم لکھنے کے باوجود ان کی تاریخی حیثیت برقرار ہے۔

سجّاد ظہیر نے ترقّی پسند تحریک کو نظریاتی اساس مہیّا کی اور پھر عمدہ وکالت سے اس تھریک کی سب سے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی کتاب ''روشنائی'' ترقّی پسند تھریک کی تاریخ بھی ہے اور کسی حد تک تنقید بھی۔ ان کے نقطۂ خیال میں بنیادی اہمیّت مارکسیّت کو حاصل ہے۔ وہ انسانی رشتوں کے تعیّن میں مادی حالات اور ذرائع پیداوار کو زیادہ اہمیّت دیتے ہیں، چنانچہ خیالات، تصوّرات اور عقائد وغیرہ سماجی عمل کا عکس ہین۔ انہوں نے باور کرایا کہ ''موجودہ دور میں احیا پرستی، ریاکاری اپنے وطن سے غدّاری ہے۔ اور آلاتِ ہنر زندگی کا دھارا موڑ دیتے ہیں۔'' سجّاد ظہیر نے اپنے نقطۂ نظر کو اشد لال اور وسیع مطالعے کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تاہم چونکہ وہ ادعا پرستی کا شکار ہو گئے تھے اس لئے ان کی تنقید میں شدید کلبیت نظر آتی ہے۔ معنوی طور پر ان کی تنقید اشتراکی نقطۂ نظر کی وضاحت اور ادب میں اس کے فیصلہ کن اظہار کی مثال ہے۔ اس تنقید نے ترقّی پسند تحریک کی نظریاتی اساس کو مستحکم بنانے میں خاصی مدد دی۔

مجنوں گورکھ پوری کی تنقید نے رومانیت سے مارکسیت کی طرف آہستگی سے سفر کیا۔ انہوں نے وجدانی تاثّر کو فیصلہ کن صورت میں پیش کرنے کے بجائے اپنا نقطۂ نظر سماجی تناظر میں پیش کیا۔ مجنوں کا مقالہ ''ادب کی جدلیاتی ماہیت'' مارکسی فلسفے کی بنیاد سائنس کو تجزیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان کی کتاب ''اب اور زندگی'' میں حسن اور فن کاری، ادب اور ترقّی۔ ادب اور مقصد وغیرہ موضوعات سے عمرانی سوالات ابھارے گئے ہیں اور مسائل کو مستقیم انداز میں حل کرنے کے بجائے قولِ محال پیدا کر دیا گیا ہے۔ مجنوں چونکہ رومانی تنقید سے مارکسی تنقید کی طرف آئے ہین اس لئے ان کے اسلوب میں ایک تخلیقی شان موجود ہے اور وہ اس تحریک میں شائستگی اور لطافت کے نمائندہ شمار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدلعلیم نے ادب اور زندگی کی بحث میں حسن کو خیر اور صداقت کی طرح ایک قدر کا درجہ دیا۔ چنانچہ انہوں نے انسانی روح

اور کائنات میں ادب کے وسیلے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور ترقّی پسند تنقید کی گم شدہ کڑی کو دوبارہ تلاش کر کے ناقدین کو جمالیاتی زاویے کی طرف متوجّہ کرادیا۔ تاہم ڈاکٹر عبدالعلیم کا تنقیدی سرمایہ اتنا کم ہے کہ بعض لوگ شاید ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوں۔

سید احتشام حسین ترقّی پسند تنقید کے سب سے موقّر، معتبر اور معتدل نقاد تھے انہوں نے نہ صرف مارکسی تنقید کو اساس بنایا بلکہ اسے زندگی کے طرزِ عمل کے طور پر بھی قبول کیا۔ احتشام حسین نے تاریخی، معاشی اور ثقافتی پس منظر میں نئے ادب کی تنقید، قدیم ادب کی پہچان اور مستقبل کے ادب کی تخلیق کے معیار وضع کئے اور تنقید میں معیارون کی صداقت ثابت کرنے کی سعی کی۔ احتام حسی ادب کو زندگی کے عام شعور کا حصّہ کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ادب مقصد نہین ذریعہ ہے۔ اس کی تعبیر کے لئے انہوں نے حکیمانہ شعور کو رہنما بنایا اور مارکسی نظریۂ ادب کو حکیمانہ شعور کی مؤثّر قوّت قرار دیا۔ چنانچہ ان کی تنقید کے بیشتر زاویے شعور کی اس حکمت سے ہی پھوٹے ہیں اور انہین مندرجہ ذیل اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اوّل۔ مختلف تنقیدی نظریّات کی تنقید اور مارکسی نظریۂ ادب کی توضیح وتشریح۔

دوم۔ مارکسی نظریّے کے مطابق ماضی کے ادب کا تنقیدی وتجزیاتی جائزہ۔

سوم۔ معاصر ادب کی تنقید، تجزیہ اور توضیح۔

ان تینوں جہتوں کے تحت احتشام حسین نے وہ فریضہ ادا کیا جو ترقّی پسند تحریک نے انہیں سونپا تھا اور جسے روبہ عمل لاکر وہ ادب میں انقلاب اور ارتقائے زندگی کو تیز تر کرسکتے تھے۔ ادب کی اس بحث میں بلاشبہ احتشام حسین نے مابعد الطّبعیات، روحانیات، جمالیات، رومانیت اور تاثریت وغیرہ کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا۔ تاہم ان کا اساسی مقصد ترقّی پسند ادب کی فوقیّت ثابت کرنا اور شعروادب کا مصرف تلاش کرنا تھا اور اس کو انہوں نے مدلّل انداز میں پیش کر کے عزّت وتوقیر کا مقام حاصل کیا۔ ترقی پسند تنقید میں احتشام حسین نظریاتی استقلال کی سب سے مستحکم آواز تھے اور آج ترقّی پسند تحریک میں جتنی روشنی نظر آتی ہے۔ اس میں سے بیشتر احتشام حسین کی تنقید سے ہی پھُوٹی ہے۔ ترقّی پسند تنقید میں احتشام حسین اعتدال اور توازن کی مثال ہے تو علی سردار جعفری انتہا پسندی کا زاویہ پیش کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری کی روش جارحانہ، لہجہ تیز اور انداز قدرے تلخ ہے۔ ان کی کتاب ''ترقّی پسند ادب'' پر مناظرے کا رنگ غالب ہے۔

ترقّی پسند تنقید کو احتشام حسین نے جو سنجیدگی عطا کی تھی، ظہیر کاشمیری نے اس میں حربی زاویہ شامل کردیا۔ چنانچہ عمل اور ردِّعمل کا جو ہنگامہ پیدا ہوا اس میں چند ایسے ناقدین بھی سامنے آئے جنہوں نے اس برق زدہ ادبی فضا کو مائل بہ اعتدال کرنے کی سعی کی۔ اس قسم کے ناقدین میں اختر انصاری دہلوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سیّد وقار عظیم، فیض احمد فیض اور عارف عہد المتین کو اہمیت حاصل ہے۔ ان میں سے اکتر انصاری نے مقصدی ادب کا دائرہ وسیع کیا اور اسے ایک کارآمد اصطلاح ''افادی ادب'' سے تعبیر کیا۔ فیض ترقی پسند تنقید میں جمالیاتی اسلوب کے نقّاد ہیں۔ بلاشبہ ان کی فکری اساس بھی جدلیاتی فلسفے پر مبنی ہے تاہم انہوں نے حسن کی محرّک قوّت سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے فعّال اور خلّاق تسلیم کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فیض نظریاتی برتری ثابت کرنے کے لئے حقائق کو مسخ نہیں کرتے بلکہ تنقید کو تاریخی صداقت سے صیقل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کا داخلی مزاج خاصہ خنک ہے اور قاری کو مشتعل کرنے کے بجائے سوچنے پر مائل کرتی

ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ترقّی پسند تنقید میں حقیقت نگاری کو ملحوظِ نظر رکھا اور مارکسزم کو اپنا عقیدہ بنائے بغیر اس سے ادب پارے کی تنقید اور تفسیر میں معاونت حاصل کی۔ چنانچہ انہوں نے تنقید کے دوسرے کارآمد حربوں کے ساتھ ساتھ مارکسی نظریّے کو خوبی اور افراط سے استعمال کیا اور اس سے غیر جانبدارانہ نتائج اخذ کئے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا طریقِ عمل سائنسی، انداز منطقی اور اسلوب جمالیاتی ہے اور وہ قاری پر یورش کرنے کے بجائے اسے ادب پارے کی افادیت اور داخلی حسن کی طرف متوجّہ کراتے ہیں۔ انہوں نے محدود موضوعات پر کام کرنے کے بجائے تنقید کو وسعت عطا کی اور ''اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے''۔ اُردو شاعری کے جدید رجحانات۔ ادب کا افادی پہلو۔ جدید اردو شاعری میں عریانی۔ اردو افسانہ نگاری پر ایک نظر۔ جدید شاعری کا انحطاط وغیرہ مضامین میں سیر حاصل جائزے مرتّب کئے۔ بلاشبہ ترقّی پسند ادب کو جو قبولِ عام حاصل ہوا ہے اس میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی عملی تنقید نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

سیّد وقار عظیم کی تنقید سماجی اور عمرانی تجزیے پر استوار ہوئی۔ انہوں نے مارکس نظریات کی بلاواسطہ تائید نہیں کی اور وہ ادب کی اعلیٰ قدرون کو صداقت کی بنیادی قدروں سے الگ شمار نہین کرتے۔ تاہم انہوں نے معنوی طور پر ادب کی مقصدیّت کو قبول کیا اور ادیب کو حقیقت کے شاعرانہ اور فنّی انعکاس پر مائل کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جو خدمت ترقّی پسند شاعری کو مقبول بنانے کے لئے سرانجام دی وہی خدمت سیّد وقار عظیم نے ترقّی پسند افسانے کے سلسلے میں خوش اسلوبی سے کی۔ بلاشبہ وقر عظیم اگر افسانے تنقید کا موجوع نہ بنانے تو اس صنف کے محاسن و معائب، اصول، فن اور اسوالیب بیان طویل عرصے تک غیر دریافت پڑے رہتے۔ آلِ احمد سرور کا تنقیدی نظریّہ یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ گہرا تعلق قائم کرنے سے ادب میں جان آجاتی ہے۔ ان کے نزدیک ادب نہ تو ذہنی دیّا شی ہے اور نہ اشتراکیت کا پرچار بلکہ انہوں نے ترقّی پسند تحریک کو ایک ایسی تحریک قرار دیا جس نے ادب کو باغِ زندگی کی ہوا کھانے کی دعوت دی۔

انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ ترقّی پسند ادب پیش کرنے والوں کا شعور بہت گہرا نہیں تھا۔ اس میں مشرق سے زیادہ مغرب، ہندوستان سے زیادہ روس اور اُردو سے زیادہ انگریزی جلوہ گر تھی۔ بالفاظ دیگر آلِ احمد سرور نے ترقّی پسند تحریک کی داخلی کیفیّت دریافت کی اور اسے غیر جانبدای سے بیان کر دیا۔ چنانچہ ان کی تنقید میں صداقت اور توان کے علاوہ عدل کا عنصر بھی موجود ہے۔

ترقّی پسند تحریک کے دورِ آخر کے نقّادوں میں ڈاکٹر محمد حسن اور عابد حسن منٹو شمر ہوتے ہیں۔ انہوں نے ترقّی پسند تھریک کی یک طرفہ قصیدہ خوانی کرنے کے بجائے اس تھریک کے معائب کو بھی درکورِ اعتنا سمجھا اور ترقّی پسند ادبا کی سطحیّت پر کھلی تنقید کی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ادب کے خارجی یا سماجی اثرات کو موضوعِ بحث بنانے کے بجائے ادب کے خارجی عوامل کو موضوع بنایا اور زندگی پر ادب کے بالوسطہ اثرات کی نشاندہی کی۔ محمد حسن عظیم ادب کی تخلیق میں نقطۂ نظر کی جرورت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ نقطۂ نظر کی وسعت، گہرائی اور کشادگی کو اہمیّت دیتے ہیں اور شعر و ادب میں انہیں کے رنگ و نور سے کیف و اثر پیدا کرنے کے آرزومند ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کی تنقید ترقّی پسند نظریّے کے آزادانہ استعمال کی مثال ہے۔ چنانچہ جب ترقّی پسند ادب یکسانیت کا شکر ہو گیا اور اس کی میکانکیت بڑھنے لگی تو انہوں نے

لکھا کہ :

ترقّی پسند تحریک کے دورِ آخر کے نقّادوں میں ڈاکٹر محمد حسن اور عابد حسن منٹو شمار ہوتے ہیں۔ انہون نے ترقّی پسند تحریک کی ایک طرفہ قصیدہ خوانی کرنے کے بجائے اس تحریک کے معائب کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا اور ترقّی پسند ادبا کی سطحیّت پر کھلی تنقید کی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ادب کے خارجی یا سماجی اثرات کو موضوعِ بحث بنانے کے بجائے ادب کے خارجی عوامل کو موضوع بنایا اور زندگی پر ادب کے بالواسطہ اثراط کی نشاندہی کی۔ محمد حسن عظیم ادب کی تخلیق میں نقطۂ نظر کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ نقطۂ نظر کی وسعت، گہرائی اور کشادگی کو اہمیّت دیتے ہیں اور شعر و ادب میں انہیں کے رنگ و نور سے کیف و اثر پیدا کرنے کے آرزومند ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کی تنقید ترقّی پسند نظریّے کے آزادانہ استعمال کی مثال ہے۔ چنانچہ جب ترقّی پسند ادب یکسانیت کا شکار ہو گیا اور اس کی میکانیکت بڑھنے لگی تو انہون نے لکھا کہ :

> ''ترقّی پسندی ایک شاداب، نمو پذیر ادبی تحریک کے بجائے اعتقاد پرست اور جامد صحافتی تحریک بن کر رہ گی..... ترقّی پسند ادیب اور نقّاد مذاقِ سلیم اور توازن کھو بیٹھے اور جب نیاز حیدر، مجروح، جیب تنویر اور وشوامتر عادل کی تنک بندیاں ان کے سامنے پیش کی گئیں تو ان میں سے کوئی بھی اس بازی گری کے خلاف احتجاج نہ کر سکا۔''

عابد حسن منٹو کا موقف یہ ہے کہ زمانہ اپنا شعور خود وضع کرتا ہے اور ہر دور میں اپنے زمانے کے اعتبار سے ترقی پسند رجھانات موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک ترقّی پسند تحیک اس لئے نئی ہے کہ اسے نئے مادی علوم کے ذریعے ادب، معاشرہ، ثقافت اور زندگی کے ہر شعبۂ حیات کو پرکھنے کا ایسا شعور حاصل ہے جو مشینی زمانے کی پیداوار ہے۔

مجموعی اعتبار سے ترقّی پسند تنقید تین ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلے دور میں اختر رائے پوری نے اس کا اوّلین نظریّہ پیش کیا اور سجاد ظہیر۔ عبدالعلیم اور احتشام حسین نے اس نظریّاتی اساس کو مضبوط بنانے اور تحریک کے بارے میں ابھرنے والے مباحث میں شکوک اور غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں تنقید کا زاویہ ناتراشیدہ اور اسلوب وجاھتی ہے۔ دوسرے دور میں علی سردار جعفری، ظہیر کاشمیری اور ممتاز حسین نے تحریک کے تنقیدی نظریّات کو فروغِ عام دینے کی سعی کی۔ چنانچہ ان کے ہان خلوص کی فراوانی نظریّاتی شدّت میں ملفوف ہے اور قطعیّت اور جارحیت کا عنصر نمایاں ہے تیسرے دور میں سیّد وقار عظیم اور عبادت بریلوی نے تحریک کے مثبت پہلو اُبھارنے کے لئے نسبتاً وسیع کینوس پر کام کیا اور ترقی پسند شاعری اور افسانے کے نقوش اجاگر کر دیئے۔ اس دور میں آل احمد سرور، عابد حسن منٹو اور ڈاکٹر محمد حسن نے نسبتاً معتدل فضا میں تحریک کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس کی ناہمواریں اجاگر کر دیں۔ اس دور کی تنقید زمانۂ امن کی تنقید معلوم ہوتی ہے۔ تاہم اس زمانے میں چونکہ تھریک بکھر رہی تھی۔ اس لئے اس کے اثرات صرف ترقی پسند ادبا تک محدود نہ رہے بلکہ ان کا اثر پورے ادب نے قبول کیا۔ اور یہ نئی تحریکوں کی نمو میں معاون بی بنا۔

ترقّی پسند تنقید کی اساسی خوبی یہ ہے کہ اس میں ادب پارے کو مارکسی نظریّے کے معیّن اصولوں پر پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ ادب پارہ جو زندگی کے ارتقاء میں معاون بن سکتا ہے۔ ترقّی پسند کہلانے کا مستحق ہے۔ تنقید نگاری کے اس انداز نے ادب میں صاف

گوئی۔حقیقت بیانی اور بے رحم صداقت کو پیش کرنے کا رجحان پیدا کی۔نقصان یہ ہوا کہ ترقی پسند نظریّے کی شدّت اور اس کے جامد الاق نے تنقید کو ایک مخصوص سانچے میں مقیّد کر دیا اور بیشتر ناقدین ایک ہی مصرع طرح پر گرہیں لگانے میں مصروف ہو گئے۔ترقّی پسند تنقید نے سائنس شعور کو راہنما بنایا اور حسن کو افادیت کے ساتھ مشروط کدیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ نقّاد نے جذباتی لطافتوں کی نفی کرنی شروع کر دی چنانچہ افسانہ میں صحافت اور شاعری میں نعرہ بازی کی حمایت ہونے لگی۔ان کمزوریوں کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف ضرری ہے کہ ترقّی پسند تنقید نے ادب پارے کی تفہیم تجزیہ اور تشریح کا ایک نیا انداز پیدا کیا اور اس کی معنوی خبیوں سے تنقید کے دورے دبستانوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

5 خلاصہ

ترقّی پسند تحریک مجموعی طور پر اجمحلال، مایوسی اور قنوطیت کا ردِّعمل تھی جسے بیسویں صدی کے ربع سوم نے اچانک ابھار دیا تھا۔ یورپ میں اسی زمانے میں فسطائی طاقتوں کو عروج حاصل ہوا تو دنیا میں انسانیت کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ہندوستان کی سیاسی تھریکون نے عام لوگوں میں آزادی کا احساس بیدار کر دیا تھا۔ادب میں حقیقت نگاری کی تحریک رومانیت پر غالب آ رہی تھی۔انگریزی علوم کے فروغ نے سائنسی شعور کو کروٹ دے دی۔ چنانچہ جاگیرداری نظام اہستہ آہستہ روبہ زوال ہونا شروع ہو گیا اس قسم کا ماحول ترقّی پسند تحریکوں کے فروغ میں ہمیشہ معاون ہوتا ہے۔چنانچہ جب سجّاد ظہیر نے اس تحریک کا آغاز کیا تو اس تحریک کا بیج قبول کرنے کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی اور اسے پھلنے پھولنے میں دیر نہ لگی۔سجّاد ظہیر اگر اس تحریک کی باقاعدہ تنظیم نہ بھی کرتے تو پریم چند کی حقیقت نگاری اور روسی نظریّات کا فروغ کسی ایسی تحریک کے فروغ پر یقیناً منتج ہوتا جو لکھے ہوئے منشور کے بغیر ہی ادب کو نئی ڈگر پر ڈال دیتا۔

چونکہ ترقّی پسند تحریک -------- کی قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے انہوں نے اس تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے تازہ خون اور نیا ولولہ فراہم کیا۔اس کا نقصان یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہوش پر جوش غالب آ گیا اور یہ فعّال تحریک انتہا پسندی کا شکار ہو کر زوال آمادہ ہو گی۔

ترقّی پسند تحریک نے عقلیت پسندی اور سائنسی شعور کو منظّم طور پر بیدار کیا۔انفعالی رومانی پر غالب آنے کی کوشش کی اور ادب کو گردوپیش کی باس اور زمین کی خوبو سونگھنے کی طرف متوجّہ کرایا۔س لحاظ سے ترقّی پسند تحریک کی ایک عطایہ بھی ہے کہ اس نے اُردو ادب کو غیر ملکی استعاروں، رموز وعلائم اور تشبیہوں سے نجات دلانے کی سعی کی، اور ادبا کو اپنے ملک کی اچیا اور مظاہر کو تخلیقات میں شامل کرنے کی مثال پیش کی۔تاہم زمین سے مجبوط وابستگی اختیار کر کے اس تحریک نے آسمان کی نفی کی اور اس طرح روحانیت کے اس سرچشمے سے جو مشرقی انسان کو داخلی طور پر رفعت آشنا کرتا ہے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ترقی پسند تھریک کی جہت مستقبل کی طرف تھی اور اس کے سامنے ایک واضح نصب العین بھی تھا۔لیکن اس تحریک کا سفر افقی تھا اور یہ عمودی پرواز سے گریزان رہی۔ چنانچہ اس تحریک نے فرد کو مادی اعتبار سے آسودگی کا خواب دھایا اور اس کے بیشتر ادبا زندگی کے عمل میں منفعت کے کاروبار کو اہمیّت دینے لگے اور یوں ادیب کی روایتی بے نیازی، انکسار اور استغنا کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔

ترقّی پسند تحریک بنیادی طور پر ادبی تحریک تھی لیکن اس کے معاونین میں بہت سے ایسے ادبا بھی شامل تھے۔ جن کے سیاسی نظریّات ان کی زندگی کے پورے کُل پر محیط تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب ایک ادبی تحریک کی قیادت سنبھالی تو ادب کو سیاست میں استعمال کرنے کی کوشش کی اور ذہنی پیش قدمی کو تیز تر کر دیا۔ اتّفاق کی بات یہ ہے کہ برِّصغیر میں ادب کی کسی تحریک کو سیاسی مقاصد کے لئے زیادہ کامیابی سے استعمال نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ جب ادب پر سیاست غالب آنے لگ تو بہت سے ادبا اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ اس تحریک کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے صرف نوجوان طبقے کو ہی متاثّر کیا۔ پرانے اور ثقہ ادبا میں سے چند ایک نے ابتدا میں اسے سرپرستی عطا کی لیکن جب اس تحریک کے غیر ادبی مقاصد نمایاں ہونے لگے تو ان ادبا نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس دور میں رشید احمد صدّیقی۔ نیاز فتح پوری۔ اختر علی تلہری۔ مولانا صلاح الدّین احمد۔ اثر لکھنوی، عبدالماجد دریابادی اور کشن پرشاد کول وغیرہ چند ایسے ادبا تھے جنہوں نے ترقّی پسند تھریک اور اس کے ادب پر شدید نکتہ چینی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کے ادب کو اشتراکی اور ملحدانہ سمجھا جانے لگا۔ آزادی کے بعد یہ گرد تو بیٹھ گئی۔ تاہم سیاست کی افراتفری نے ایک مرتبہ پھر اس تحریک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور بالآخر اس تحریک کا مضبوط ڈھانچہ سیاسی انداز میں ٹوٹ پھوٹ گیا۔

۱۹۷۲ء میں جب ملک میں نئی بیداری آئی تو ترقّی پسند تحریک کے احیائے نو کی کوشش ہوئی۔ کراچی، لاہور اور پشاور میں اس تحریک کی تنظیمیں قائم کی گئیں اور قدیم ترقی پسند ادبا کی شفقت اور تعاون بی حاصل کیا گیا۔ لیکن اب دریا کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ تحریک اپنا فعّال دور ختم کر چکی تھی مزید یہ کہ ترقّی پسند مصنّفین کی نئی انجمن کو سجّاد ظہیر جیسا مخلص، انقلابی اور ایثار یہ رہنما نصیب نہ ہو سکا۔ جن ادبا نے اپنے عہد شباب میں اس تحریک کے لئے تازہ خون دیا تھا ان میں سے بیشتر اب بڑھاپے کے برگد تلے آسودگی سے ستا رہے تھے یا کاروبارِ حیات میں بری طرح مصروف تھے۔ ان میں تحریک کے لئے پسینہ بہانے کی سکت بھی نہیں تھی حقیقت میں یہ وقت ترقّی پسند تحریک کے انقلابی ثمرات سمیٹنے کا وقت تھا۔ چنانچہ تحریک کے قدیم رہنما اپنی سابقہ خدمات کا اعتراف کرانے کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں شخصیت سازی کا رجحان پیدا ہوا۔ ادیب نے انقلابی ہیرو کا درجہ اختیار کر لیا۔ کتابوں کی رونمائی، ترقّی پسند شخصیتوں پر رسائل کے خاص نمبروں کی اشاعت، ادبا کے ساتھ شامیں منانے اور سالگرہ کے جشن منعقد کرنے کے رجحانات اس ہیرو پرستی کا ہی شاخسانہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقّی پسند تحریک اس جذبۂ ایثار سے محروم ہو گئی جس کے زیرِ اثر ادیب ادب کی آبیاری کرتا ہے۔ بلاشبہ تنظیمی سطح پر انجمن ترقّی پسند مصنّفین زندہ ہو گئی۔ لیکن یہ اچھی قیادت سے محرومی کی بنا پر پرانی تحریک کی محض ایک یاد تھی اور آخر کار ادب کی دنیا میں کوئی تنمایاں کارنامہ سرانجام دینے سے قبل ہی یہ تنظیم بھی مردہ ہو گئی۔

6 مشق کے سوالات :

۱۔ ترقی پسند تحریک نے ادب پر کیا اثرات ڈالے؟ ایک اجمالی جائزہ لیجئے۔

۲۔ اُردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کا کیا اثر ہوا؟ وضاحت کیجئے۔

۳۔ اردو شاعری کو موضوعاتی سطح پر ترقی پسند تحریک نے کس حد تک متاثر کیا؟ اہم شعرا کے حوالے سے واضح کیجئے۔

۴۔ اردو ۲ کے چند اہم ترقی پسند شعرا سے واقفیت کا اظہار کیجئے۔

۵۔ اردو کے اہم ترقی پسند نقادوں کی خدمات کا تعارف پیش کیجئے۔

7 مزید مطالعہ کے لئے کتابیں :

۱۔ ترقی پسند تحریک کا پچاس سالہ سفر ۔ قمر رئیس، عاشور کاظمی

۲۔ ترقی پسند تحریک، سفر در سفر ۔ علی احمد فاطمی

۳۔ بیسویں صدی میں اُردو ادب۔ ۔ قمر رئیس

۴۔ ترقی پسند ادب ۔ عزیز احمد

۵۔ اردو میں ترقی پسند تحریک ۔ خلیل الرحمن اعظمی